

گیت ”سمی میری وار میں داری“ کا تہذیبی ولسانی جائزہ

ڈاکٹر غلام یسین

اسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر سیدہ شاہین زیدی

82-C، ویلنشیاناؤن، لاہور

ڈاکٹر عثمانیہ سلطانہ

عسکری X، لاہور

Abstract:

Guru Jambheshwar Ji was born in 1451 CE in Pipasar village, Nagaur district, Rajasthan, into a Panwar Rajput family. At the age of 34, in 1485 CE, he founded the Bishnoi sect at Samrathal Dhora (a sand dune). This was a period of severe drought and natural calamities in Rajasthan.

Guru Jambheshwar Ji laid down 29 principles for his followers, who became known as "Bishnoi" (Bish meaning twenty, and Noi meaning nine). These principles emphasize environmental protection, compassion towards animals, ethical conduct, and spiritual discipline. His teachings are compiled in "Shabdavani," which contains 120 verses.

The sacrifice of Amrita Devi and others is a poignant yet proud event in Bishnoi history. This sacrifice was not for a folk character named "Sammi," but to save Khejri trees. While "Sammi" is a character from a folk song, Amrita Devi and other Bishnois' sacrifice is a real historical event.

In the song "Sammi Meri Waar Main Waari," the word "Sammi" originates from Sanskrit. The word "Waari" is used as a past tense verb (first-person singular feminine) in Urdu, Punjabi, and Seraiki. Nouns like "Chobare" (balcony/upper room) and "Dil" (heart) are used with the same meaning across these three languages. The word "Meri" (my) carries the same meaning in both Urdu and Punjabi. Words like "Ni" and "Soye" are commonly used in Punjabi, while other words in the song are found in Punjabi and Seraiki, sometimes with identical spellings and sometimes with minor variations.

مقالہ:

سمی میری وار، میں داری
میں داری اے نی سٹی اے

۱۷۷۳ء کے لگ بھگ جو دھ پور کی تہذیب راٹھور حکمرانوں کی سرپرستی میں پروان چڑھ رہی تھی اور یہ خطہ، جسے اس وقت ریاست مارواڑ کے نام سے جانا جاتا تھا، اپنی مخصوص ثقافتی اور سماجی خصوصیات کا حامل تھا۔ یہ دور مغلیہ سلطنت کے زوال اور مراٹھوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا تھا، جس کے سیاسی اتار چڑھاؤ کے اثرات مقامی تہذیب پر بھی پڑ رہے تھے۔

1773ء کے آس پاس جو دھ پور کی تہذیب کے چند اہم پہلو درج ذیل ہیں:

1- حکمرانی اور دربار:

• جو دھ پور پر راٹھور خاندان کی حکمرانی تھی، جو اپنی بہادری اور فنون کی سرپرستی کے لیے جانے جاتے تھے۔ 1773ء کے قریب مہاراجا وجے سنگھ حکمران تھے۔

• دربار میں سیاسی سرگرمیاں جاری تھیں، اور مغلیہ اثرات کمزور پڑنے کے ساتھ ساتھ مراٹھوں کی مداخلت بڑھ رہی تھی۔ اس سیاسی عدم استحکام کے باوجود، دربار علم و فن کا مرکز تھا۔

• حکمران اور امراء فنکاروں، شاعروں اور علماء کی سرپرستی کرتے تھے، جس سے فنون لطیفہ اور ادب کو فروغ حاصل تھا۔

2- سماجی زندگی:

- مارواڑ کا سماج روایتی ہندوستانی نظام پر مبنی تھا جس میں ذات پات کا نظام رائج تھا۔ راجپوت (حکمران اور جنگجو طبقہ) سماجی hierarchies میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔
- برہمن، ویش (تاجر اور مہاجن) اور شودر دیگر اہم سماجی گروہ تھے۔
- خواتین کا اپنا ایک مقام تھا، خاص طور پر راجپوت گھرانوں میں۔ پردے کا رواج موجود تھا، لیکن اندرون خانہ خواتین کو خاصا اختیار حاصل ہو سکتا تھا اور وہ بعض اوقات سیاسی امور میں بھی اثر انداز ہوتی تھیں۔ گلاب رائے جیسی بااثر شخصیات کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے دربار پر اثر ڈالا۔
- تاجر طبقہ معیشت میں اہم کردار ادا کرتا تھا اور تجارت کے راستے جو دھ پور کی خوشحالی کا باعث تھے۔
- مذہبی رواداری پائی جاتی تھی اور ہندوؤں کے مختلف فرقوں کے ساتھ ساتھ جین مت کے پیروکار بھی موجود تھے جن کا معیشت میں خاصا عمل دخل تھا۔

3۔ فنون لطیفہ اور فن تعمیر:

- جو دھ پور فن تعمیر کا ایک اہم مرکز تھا۔ قلعہ مہراں گڑھ Mehrangarh Fort اس دور کی فن تعمیر کا عظیم شاہکار تھا اور اس میں مختلف ادوار میں توسیع اور تزئین و آرائش کا کام جاری رہا۔
- مغل اور راجپوت فن تعمیر کا امتزاج عمارات میں نظر آتا تھا۔ جالیاں (پتھر کی جالیاں)، جھروکے (مہراب دار کھڑکیاں) اور دربار ہال اس دور کی خصوصیت تھے۔
- تصویر کشی (پینٹنگ) کو دربار کی سرپرستی حاصل تھی۔ miniature paintings تیار کی جاتی تھیں جن میں درباری زندگی، mythological کہانیاں، شکار کے مناظر اور portraits شامل ہوتے تھے۔
- موسیقی اور رقص بھی دربار اور سماجی زندگی کا اہم حصہ تھے۔ کلاسیکی موسیقی اور لوک موسیقی دونوں رائج تھیں۔
- 4۔ ادب اور علم:
- دربار میں سنسکرت، ہندی اور راجستھانی زبانوں میں ادبی تخلیقات ہوتی تھیں۔ درباری شعر اور علماء موجود تھے۔
- توارخ اور شجرے محفوظ رکھنے کا رواج تھا۔ Charan کہلانے والے روایتی بھٹ اور شاعر یہ کام سرانجام دیتے تھے اور ان کا سماج میں احترام تھا۔
- مذہبی اور اخلاقی نوعیت کی تحریریں بھی موجود تھیں۔

5۔ مذہب اور عقائد:

- ہندو مت ریاست کا اکثریتی مذہب تھا، اور مختلف دیوتاؤں کی پوجا رائج تھی۔ مندر فن تعمیر کا اہم حصہ تھے۔
- جین مت کے پیروکار، خاص طور پر ویش طبقے میں، موجود تھے اور ان کے اپنے معبد تھے۔
- صوفیائے کرام اور درگاہوں کا اثر بھی موجود تھا، جو علاقے کی مشترکہ روحانی روایت کا حصہ تھا۔
- 1773 کے آس پاس جو دھ پور کی تہذیب اپنی ایک منفرد شناخت رکھتی تھی، جو راٹھور حکمرانوں کی روایت، مقامی سماجی ڈھانچے، فنون لطیفہ سے محبت اور مختلف ثقافتی اثرات کے امتزاج سے بنی تھی۔ یہ ایک ایسا دور تھا جہاں سیاسی چیلنجز کے باوجود، فنون، ادب اور سماجی رسوم و رواج زندہ تھے۔
- اس عہد میں جو دھ پور میں مہاراجہ بکے سنگھ کی حکومت تھی جو کہ ایک سخت گیر حکمران تھا۔ اس کے دور میں خانہ جنگی سماحول بنا رہا نتیجہً معاشرہ امن اور سکون سے محروم رہا۔ مختلف ویب سائٹس پر کئی مضامین میں اس عہد کے راجا کا نام ایسے سنگھ بتایا گیا ہے:

”تیسرے علاقہ گوڈوار جو میواڑ کی مغربی شمالی طرف اراولی پہاڑ کے نیچے پھیلا ہوا ہے باغیوں کے قبضے میں آجانے کے اندیشے سے تین ہزار سواروں کی مدد حاضر رکھنے کے اقرار پر جو دھ پور کے مہاراجہ بکے سنگھ کو حفاظت کے لیے دے دیا گیا تھا وہ بھی باوجود اقرار پر عمل نہ کرنے کے واپس نہیں ملا اس مہاراجا کے عہد میں ہمیشہ ملکی اور خانگی

فساد رہنے سے علاقہ تباہ ہوا۔ وقائع راجپوتانہ میں لکھا ہے کہ مہارانا اپنی تند خوئی اور ظلم کی پاداش میں سرداران

اور پور کی ملاوٹ سے راجراجہ بوندی کے ہاتھ سے سب ۱۸۲۹ء مطابق ۱۷۷۳ء میں مارا گیا۔“ [1]

گورو جم بھیشور جی (جنہیں جم بھاجی بھی کہا جاتا ہے) ایک عظیم سنت، فلسفی اور ماحولیات کے علمبردار تھے جو 15 ویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے علاقے راجستھان میں گزرے۔ انہیں بشنوی فرقے کا بانی مانا جاتا ہے، جو آج بھی فطرت کے تحفظ اور پائیدار طرز زندگی کے لیے جانا جاتا ہے۔

گورو جم بھیشور جی 1451ء میں راجستھان کے ضلع ناگور کے گاؤں پیپاس میں ایک پنوار راجپوت خاندان میں پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بچپن سے ہی Introverted اور مراقبہ کی طرف مائل تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے 27 سال گائے چرانے میں گزارے۔ 34 سال کی عمر میں، 1485ء میں، انوں نے سمراتھل دھور (ریت کے ایک ٹیلے) پر بشنوی فرقے کی بنیاد رکھی۔ یہ وہ دور تھا جب راجستھان میں شدید خشک سالی تھی اور لوگ قدرتی آفات سے پریشان تھے۔ گورو جم بھیشور جی نے اپنے پیروکاروں کے لیے 29 اصول وضع کیے، جنہیں وہ ”بشنوی“ (پیش یعنی پیس اور نوئی یعنی نو) کہلاتے ہیں۔ ان اصولوں میں ماحولیات کے تحفظ، حیوانات کے ساتھ ہمدردی، اخلاقی طرز عمل اور روحانی نظم و ضبط پر زور دیا گیا ہے۔ ان کی تعلیمات ”شبدوانی“ کہلاتی ہے جس میں 120 اشعار شامل ہیں۔

بشنوی فرقہ گورو جم بھیشور جی کی تعلیمات پر سختی سے عمل پیرا ہے۔ ان کے 29 اصول ان کی زندگی کا منشور ہیں اور یہ اصول انہیں دیگر ہندو فرقوں سے

ممتاز کرتے ہیں۔ ان اصولوں میں سے چند نمایاں یہ ہیں:

- جانداروں پر رحم کرنا (حیوانات کا تحفظ)
- سبز درختوں کو نہ کاٹنا (شجر کاری اور جنگلات کا تحفظ)
- بچ بولنا
- حرام گوشت نہ کھانا اور نشے سے پرہیز کرنا (شراب، افیم، تمباکو)
- صبح سویرے اٹھنا کرنا (جسمانی صفائی)
- عبادت کرنا اور بھجن گانا
- لالچ، غصہ اور حسد سے بچنا
- پانی، دودھ اور لکڑی کو صاف کر کے استعمال کرنا تاکہ چھوٹے کیڑے مکوڑے نہ مریں
- جھوٹ نہ بولنا اور غیبت سے بچنا

بشنوی برادری کی سب سے بڑی پہچان ان کا فطرت سے unbreakable تعلق اور اس کے تحفظ کے لیے ان کی قربانیاں ہیں۔ 1730ء میں کھیجری گاؤں

میں پیش آنے والا واقعہ ان کے ماحولیاتی عزم کا سب سے بڑا ثبوت ہے، جب مہاراجا جودھ پور کے حکم پر درختوں کو کاٹنے سے بچانے کے لیے 363 بشنوی افراد نے اپنی جانیں قربان کر دیں۔

گورو جم بھیشور جی کا فلسفہ فطرت اور انسان کے درمیان ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ انہوں نے آج سے صدیوں قبل ماحولیاتی تحفظ کی اہمیت کو سمجھا جب یہ تصور عام نہیں تھا۔ انہوں نے روحانی تعلیمات کو ماحولیاتی اصولوں کے ساتھ اس طرح جوڑا کہ ان کے پیروکار فطرت کی حفاظت کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھیں۔

بشنوی فرقہ آج بھی راجستھان اور ملحقہ علاقوں میں آباد ہے اور اپنے اصولوں پر عمل پیرا ہے۔ وہ صحرائی ماحول میں حیوانات اور نباتات کے تحفظ کے لیے کوشاں ہیں۔ گورو جم بھیشور جی کی تعلیمات اور بشنوی برادری کا طرز زندگی دنیا بھر میں ماحولیاتی تحفظ کی تحریکوں کے لیے تحریک کا باعث ہے۔ انہیں ہندوستان کا پہلا عظیم ماحولیات دان کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ان کی legacy آج بھی زندہ ہے اور ہمیں فطرت کے ساتھ احترام کا رشتہ استوار کرنے کا درس دیتی ہے۔

گورو جم بھیشور جی (جنہیں جم بھاجی بھی کہا جاتا ہے) ایک عظیم سنت، فلسفی اور ماحولیات کے علمبردار تھے جو 15 ویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے علاقے راجستھان میں گزرے۔ انہیں بشنوی فرقے کا بانی مانا جاتا ہے، جو آج بھی فطرت کے تحفظ اور پائیدار طرز زندگی کے لیے جانا جاتا ہے۔

امریتا دیوی اور دیگر افراد کی قربانی، جو ہشونوی برادری کی تاریخ کا ایک نہایت دل خراش مگر قابل فخر واقعہ ہے۔ تاہم یہ قربانی ”سی“ نامی لوک کردار کے لیے نہیں تھی، بل کہ کھجڑی کے درختوں کو بچانے کے لیے دی گئی تھی۔ سی ایک لوک گیت کا کردار ہے، جب کہ امریتا دیوی اور دیگر ہشونیوں کی قربانی ایک حقیقی تاریخی واقعہ ہے۔

یہ واقعہ 1773ء میں راجستھان کے گاؤں کھجڑی میں پیش آیا۔ اس کا پس منظر اور تفصیلات کچھ یوں ہیں:

واقعہ کا پس منظر:

1. مہاراجا کا حکم 1773ء میں جودھ پور کے مہاراجا ابھے سنگھ کو اپنے محل کی تعمیر کے لیے لکڑی کی ضرورت پڑی۔ انہوں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ کھجڑی گاؤں سے، جہاں کھجڑی کے درختوں کی بہتات تھی، لکڑی کاٹ لائیں۔
2. ہشونیوں کا فطرت سے لگاؤ: ہشونوی برادری، اپنے گرو جم بھیشور جی کی تعلیمات کے مطابق، فطرت، خاص طور پر درختوں اور جانوروں کا بے حد احترام کرتی ہے۔ کھجڑی کا درخت ہشونیوں کے لیے خاص طور پر مقدس ہے۔ ان کے اصولوں میں سبز درختوں کو کاٹنا سختی سے منع ہے۔ امریتا دیوی اور دیگر کی قربانی:

جب مہاراجا کے آدمی کھجڑی گاؤں میں درخت کاٹنے پہنچے تو ہشونوی برادری نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ اس دوران، امریتا دیوی نامی ایک ہشونوی خاتون نے درختوں کو بچانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے کا فیصلہ کیا۔

1. امریتا دیوی کی مزاحمت: امریتا دیوی درخت سے لپٹ گئیں اور مہاراجا کے آدمیوں سے کہا کہ وہ درخت کو کاٹنے سے پہلے انہیں کاٹنا ہو گا۔ ان کے تاریخی الفاظ تھے: ”سرسائے لکھ رہے، تو بھی سستو جان“ (اگر سر کاٹوانے سے بھی درخت بچ جائے تو یہ سودا سستا ہے)۔
2. شہادت کا سلسلہ: مہاراجا کے آدمیوں نے امریتا دیوی کو درخت سمیت کاٹ دیا۔ ان کی تین بیٹیوں نے بھی اپنی ماں کی پیروی کرتے ہوئے درختوں کو بچانے کے لیے اپنی جانیں دے دیں۔
3. اجتماعی قربانی: امریتا دیوی اور ان کی بیٹیوں کی قربانی دیکھ کر گاؤں کے دیگر ہشونی بھی درختوں سے لپٹنا شروع ہو گئے۔ مہاراجا کے آدمیوں نے بے دردی سے درختوں کے ساتھ ساتھ انہیں بھی کاٹنا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک 363 ہشونیوں نے درختوں کی خاطر اپنی جانیں قربان نہیں کر دیں۔

اس دل خراش واقعے کی خبر جب مہاراجا تک پہنچی تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ انہوں نے فوری طور پر درختوں کی کٹائی رکوائی اور ہشونوی برادری سے معافی مانگی۔ انھوں نے ایک فرمان جاری کیا کہ ہشونوی علاقوں میں آئندہ کبھی درخت نہیں کاٹے جائیں گے۔

امریتا دیوی اور 363 دیگر ہشونیوں کی یہ قربانی تاریخ میں ماحولیات کے تحفظ کے لیے سب سے بڑی اور مثالی قربانیوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ واقعہ ہشونوی برادری کے فطرت سے گہرے تعلق اور ان کے principles پر ان کے غیر متزلزل یقین کا ثبوت ہے۔ یہ آج بھی دنیا بھر میں ماحولیاتی تحریکوں کے لیے پریرنا کا سرچشمہ ہے۔

واضح رہے کہ یہ قربانی درختوں کو بچانے کے لیے تھی اور اس کا تعلق سی نامی لوک کردار یا اس سے وابستہ گیت سے نہیں ہے۔ یہ ایک الگ تاریخی واقعہ ہے جس نے ہشونوی برادری کی شناخت اور ان کے ماحولیاتی عزم کو دنیا بھر میں روشناس کرایا۔

راجستھان میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جسے ”جنڈ“ اور ”کھجڑی“ کہتے ہیں۔ سندھ میں ”کنڈی“، سرائیکی میں ”کنڈا“، پنجاب میں ”جنڈ“، عربی میں ”غاف“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جب کہ سنسکرت اور گجراتی میں یہ ”سی“ کہلاتا ہے۔

کھجڑی یا جنڈ کی تلاش میں جودھ پور کے تمام علاقوں کو چھاننا گیا کیوں کہ اتنی زیادہ مقدار میں لکڑی کا کسی ایک چھوٹے سے علاقہ سے دست یاب ہونا ممکن نہیں تھا۔ اسی سلسلہ میں راجہ کے سپاہی ایک گاؤں تک جا پہنچے جس کا نام بھی ”کھجڑی“ ہی تھا۔ اس گاؤں میں یہ درخت کثیر تعداد میں موجود تھے۔ یہ علاقہ پورے خطہ میں سرسبز و شاداب تھا۔ یہ گاؤں گرو جم بھیشور جی کے اطاعت گزاروں کا گڑھ مانا جاتا تھا۔ گرو جم بھیشور جی کے پیروکار اپنے گرو کے انتیس (۲۹) انسان اور ماحول دوست اصولوں کی بنا پر ہشونوی کہلاتے تھے۔ ان کے عقیدہ کے مطابق کسی بھی جانور کا شکار اور ہرے بھرے درخت کو کاٹنے کی قطعاً کوئی اجازت نہیں

ہوتی۔ امریتادیوی، جس کی تین بیٹیاں آسو، رتنی اور بھاگوانی تھیں، اسی کھجری گاؤں کی رہنے والی تھی۔ امریتادیوی کی موجودگی میں راجہ کے سپاہیوں نے سنی کو کاٹنا چاہا تو امریتادیوی درمیان میں آگئی اور انھیں ایسا کرنے سے روکا مگر سپاہی نہ رکے تو امریتادیوی درخت کے تنے سے یہ کہتی ہوئی لپٹ گئی کہ اگر اس درخت کو کاٹنا چاہتے ہو تو اس کے لیے پہلے مجھے کاٹنا پڑے گا تو سپاہیوں نے امریتادیوی کے جسم کے ٹکڑے کر دیے، امریتادیوی کے درخت کے ساتھ کھٹنے کے بعد ان کی تینوں بیٹیوں آسو، رتنی اور بھاگوانی نے بھی یہ کہتے ہوئے ماں کی پیروی کی:

سم سی میری وار، میں واری
میں واری اے نی سنی اے

ترجمہ: اے سنی! میری جان تجھ پر قربان ہونے کی خاطر حاضر ہے۔ میں تجھے بچانے کے لیے اپنی جان فدا کرتی ہوں۔

امریتادیوی اور ان کی بیٹیوں کی موت کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پورے علاقے میں پھیل گئی اور لوگوں نے اپنے گاؤں کے درختوں کو بچانے کے لیے ان سے لپٹ کر جانوں کا نذرانہ پیش کرنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے کہ راجہ کو خبر ہوتی تین سو تریسٹھ (۳۶۳) افراد نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر دیے تب راجہ ایسے سنگھ کی مداخلت سے قتل و غارت گری کا یہ سلسلہ رکا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مختلف خطوں میں اسی درخت کے نام کی مناسبت سے عورتوں کا نام بھی ”سنی“ رکھا جاتا ہے۔ راجستھان کے ضلع ناگور میں ایک گاؤں کا نام پیپاسر ہے جہاں راجپوتوں کا پنوار خاندان رہتا تھا۔ ۱۴۵۱ء کو ٹھاکر لوہت جی پنوار اور شری میتی منتوں اور صبر آزما طویل انتظار کے بعد ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام جم بھیشور رکھا گیا۔

”راجستھان کے ضلع ناگور کے گاؤں پیپاسر میں راجپوتوں کے پنوار خاندان کے ٹھاکر لوہت جی پنوار اور شری میتی

ہنسادیوی کو خدا نے ۱۴۵۱ء میں ایک بیٹے سے نوازا، شادی کے طویل عرصے بعد منتوں مردوں کے ثمر اس بیٹے

کا نام جم بھیشور تجویز ہوا۔“ [2]

یہ وہی دن تھا جس دن بھگوان کرشن کا جنم ہوا تھا۔ اس بچے کا مزاج بچپن ہی سے اپنے ہم عمر بچوں میں سب سے الگ تھلگ تھا۔ یہ ہمیشہ اپنے آپ میں مگن رہتا۔ شری کرشن جی مہاراج کی مانند ۲ سال تک بن باسی رہی۔ ۱۴۵۸ء کی خوف ناک قحط سالی پوری راجستھان کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ راجستھان کے باسی پڑوسی ریاستوں میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ صورت حال دیکھ کر رنجیدہ خاطر رہتے۔ ان نامساعد حالات پر غور و فکر کرتے رہتے جس کے نتیجے میں انھوں نے اپنے انتہی (۲۹) اصولوں کو ترتیب دیا جنھیں برصغیر پاک و ہند کے مکینوں اور ماحول کے درمیان دوستی کا پہلا اعلامیہ کہا جاسکتا ہے۔ قلوب و اذان کے دروازے والی اس دستاویز کے باعث جم بھیشور ”گرو جم بھیشور“ کہلانے لگے۔ انہی اصولوں کی پیروی کرنے والوں کو بشنوتی کہا جانے لگا اور ان کے اطاعت گزار پیار سے ”جم بھوجی“ کہلانے لگے:

”گرو جم بھیشور جی کے انہی ۲۹ اصولوں کی بنیاد پر ان کے پیروکار (بش ۲۰، نو ۹) بشنوتی کہلاتے ہیں یعنی ۲۹ اصولوں

کو ماننے والے۔ ان کے چاہنے والے انھیں پیار سے (جم بھوجی) بھی کہتے ہیں۔“ [3]

اس دستاویز کے آٹھ اصول براہ راست جنگلی حیوانات اور نباتات کی حیات کے ضامن بن گئے۔ سات اصول سماجی تعلقات کے حوالے ایک ضابطہ کی حیثیت اختیار کر گئے۔ دس اصول بشنوتیوں کی ذاتی صحت کی حفاظت اور طہارت کی تعلیم کا ذریعہ بنے اور باقی چھ اصول عبادت سے متعلق ہو گئے۔ گرو جم بھیشور جی کی انہی تعلیمات کے نتیجے میں راجستھان میں پاکستانی صحرائی علاقوں کی بہ نسبت زیادہ درخت پائے جاتے ہیں اور پاکستان میں معدوم ہوتی ہوئی کالے ہرن اور نیل گائے کی نسل راجستھان میں بہ کثرت پائی جاتی ہے۔ بشنوتیوں کی اس ماحول دوستی اور مہربانی کے باعث ان کی خواتین صحرائی جانوروں کے لاوارث بچوں کو اپنا دودھ تک پلانے سے ذرا بھی ہچکچاتیں۔ اس طرح وہ خواتین جنگلی حیات کو پروان چڑھانے کا کوئی بھی موقع اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔ انسانوں اور جانوروں کے مابین ایسی ہم آہنگی اور دوستی کا ثور شہد شاید ہی دنیا کے کسی اور کونے مل سکے۔

گرو جم بھیشور جی نے ریت کے ایک بڑے ٹیلے پر، جو سارا تھل دھوراکے نام سے مشہور ہے، چونتیس (۳۴) سال کی عمر میں اپنے اس عقیدہ کی بنیاد رکھی جسے بجا طور پر فرقہ یا عقیدہ کہنے کے بجائے ”ماحول دوست گروہ کہا جاسکتا ہے۔

مذہبی فرقوں کی بنیاد اور شناخت ان کی عبادات ہوتی ہیں جب کہ بشوئیوں کی پہچان ان کے روزمرہ اصولوں کی بنا پر ممکن ہے۔ اکثر مذہبی فرقے اپنے ازلی وابدی ہونے کے اصرار کے باعث اپنی مذہبی رسومات اور عبادات میں تبدیلی کی خواہش یا جسارت کو مذہبی دائرہ سے خروج تعبیر کرتے ہیں۔ یہ بدلتی ہوئی زندگی تغیر سے عبارت ہے۔ بعض مذہبی فرقے اپنی لائینی مذہبی رسومات اور عبادات کے نتیجہ میں زندگی کی افادیے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ کرشن جی کی تعلیمات کے پیرو ہونے کے باوجود گروجم بھیشورجی نے مرنے والوں کی آخری رسومات میں چندن کی بہت زیادہ لکڑی کے استعمال اور مردہ تن جلانے کے بجائے دفن کرنے کا طریقہ کار رائج کیا۔ گروجم بھیشورجی نے اپنی زندگی کے بقیہ اکیاون (۵۱) برس راجستھان کے ساتھ ساتھ برصغیر کے طول و عرض میں اپنے اصولوں کا پرچار کرتے ہوئے بسر کر دیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاص طور پر موجودہ عہد کے ہندوستان میں ان کی تعلیمات کے اثرات نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں جب کہ عام طور پر پاکستان بنگلہ دیش اور ارد گرد کے دیگر خطوں میں کچھ نہ کچھ اثرات ضرور دکھائی دے جاتے ہیں۔

عہد حاضر میں راجستھان کے ساتھ ساتھ بشوئیوں کی ایک کثیر تعداد ہندوستان کی ریاستوں گجرات، ہریانہ، پنجاب اور دہلی کی مکین ہے۔ راجستھان کے ضلع بیکانیر، جو پاکستان کے ضلع بہاول پور کے مقابل ہندوستان کا حصہ ہے، کے ایک مقام ”موکم“ پر بشوئیوں کے مذہبی اجتماعات سال میں دو بار منعقد ہوتے ہیں جنہیں ”میلہ“ کا نام دیا گیا ہے۔

گروجم بھیشورجی کی تعلیمات شاعرانہ انداز میں ”شبدوانی“ کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ کلا یک سوئیس (۱۲۰) شبد یعنی نظمیں اب تک دست یاب ہو سکی ہیں۔ ان کی یاد میں ہندوستان کی ایک ریاست ہریانہ میں ”گروجم بھیشورجی یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی“ کے نام سے قائم کی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جہاں بلا تفریق مذہب و ملت تعلیمی سہولیات موجود ہیں۔ ان کی تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ امریتادپوی کے بعد اس کی بیٹیوں سمیت کئی دیگر بشوئیوں نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر دیے۔ ہر عہد میں قربانیوں کا یہ سلسلہ چلتا رہا ہے اور چل رہا ہے۔ کبھی کہیں کوئی کارما اور گورا (۱۶۰۴ء) میں اپنے گاؤں کے ”سمی“ کے درخت بچانے کے لیے اپنی جانیں پیش کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں تو کہیں کوئی نہال چند (۱۹۹۶ء) میں اپنی جان کی بازی ہار جاتا ہے۔ یہ قربانیوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ فردا فردا ان کا تذکرہ کرنا ممکن نہیں۔

گروجم بھیشورجی ۱۵۳۶ء میں ۸۵ برس عمر پا کر اس جہان فانی کو چھوڑ گئے۔ موکم ضلع بیکانیر میں انہیں ہندو رسومات کے مطابق جلانے کے بجائے دفن کر دیا گیا:

”گروجم بھیشورجی ۱۵۳۶ء میں ۸۵ سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوئے اور موکم ضلع بیکانیر کے مقام پر ان کا جسد خاکی، انہی کی تعلیمات کے مطابق سپرد خاک کیا گیا۔“ [4]

یکم اکتوبر ۱۹۹۸ء کو ہندوستان کے ایک مشہور فن کار سلمان خان نے کالاہرن شکار کرنے کی جسارت کی جس کے نتیجہ میں اس پر مقدمہ دائر کیا گیا۔ بشوئی اپنے اصولوں کی پاس داری میں مصلحت سے مبرا اور اٹل واقع ہوئے ہیں جس کی وجہ سے سلمان خان کے خلاف مقدمہ آج تک قائم ہے اور وہ ضمانت رہا اپنی زندگی گزار رہے ہیں:

”یکم اکتوبر ۱۹۹۸ء کو رات کے وقت پونم چند بشوئی نے انہیں ایک کالاہرن شکار کرتے دیکھ لیا اور اس کی شکایت پر نہ صرف سلمان خان گرفتار کر لیے گئے بل کہ تمام تزکوششوں کے باوجود نہ کوئی گواہ منحرف ہوا اور نہ ہی مدعی مقدمہ سے دستبردار ہوا۔“ [5]

جہاں تک بشوئی علاقوں میں گروجم بھیشورجی کی تعلیمات پر عمل درآمد کی خاطر جاں نثار موجود ہیں وہاں برصغیر کے دور دراز علاقوں میں بھی ان کی تعلیمات اور ان کے پیروکاروں کی قربانیاں ایک باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔

امریتادپوی اور ان کی تقلید میں تین سو تریسٹھ (۳۶۳) ساتھیوں کے قربانی کے دو سو چالیس (۲۴۴) سال کے بعد ۲۶ مارچ ۱۹۷۴ء کو ہندوستانی ریاست اتر اکنڈ کے ضلع چولی کے ایک علاقہ ہموال کے بھی ایک دور دراز دیہات ”رینی“ کی باہمت اور جزی کسان خواتین نے جنگل کے ٹھیکہ داروں اور سرکاری افسران کی مکارانہ چالوں اور دھونس دھمکیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے درختوں کی حفاظت کی۔ ٹھیکہ داروں نے مکارانہ چال چلتے ہوئے درختوں کی کٹائی کی خاطر ایک ایسا دن منتخب کیا جس دن گاؤں کے سبھی مرد و درو واقع سرکاری دفتر سے وجہات کی وصولی کے لیے گئے ہوئے تھے۔ ٹھیکہ داروں کا خیال تھا کہ خواتین مزاحمت نہیں کر سکیں گی

مگر خوف اور لالچ سے بے نیاز کسان خواتین آخری حربہ اپناتے ہوئے درختوں سے لپٹ کر کٹ مرنے کے لیے تیار ہو گئیں۔ اس وقت تک درختوں کی پہرہ داری میں مصروف رہیں جب کہ ان کے مرد واپس نہیں آگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے اگلے پندرہ سالوں تک درختوں کی کٹائی پر پابندی عائد کر دی:

”یہ تحریک اتنی موثر تھی کہ ہمالیہ کے پورے دامن میں لوگوں نے اس حربہ کو اپنایا۔ یہ احتجاج برسوں کامیابی سے جاری رہا اور آخر ۱۹۸۰ میں وزیراعظم اندرا گاندھی نے اگلے ۱۵ برسوں کے لیے (جب تک پورا علاقہ پھر سے سرسبز نہ ہو جائے) پورے ہمالیائی خطے میں درختوں کی کٹائی پر پابندی لگا دی۔ پھر اسی تحریک نے عوام کی امنگوں سے قریب ترین جنگلات کی سرکاری پالیسی کو جنم دیا۔“ [6]

تاریخی کتب میں بشوئیوں کی روایات کی پیروی میں عوام کی اپنے ماحول اور بیڑ پودوں سے محبت کی اس داستان کو ”چیکو تحریک“ کا نام بھی دیا گیا ہے۔ اس تحریک نے جہاں بہت سے مرد راہ نمائوں کو جنم دیا وہاں خواتین راہ بروں کی بھی کمی دکھائی نہیں دیتی۔ سندرلال بہو گنا نے چیکو تحریک کو پروان چڑھانے کے لیے ۱۹۸۱ سے لے کر ۱۹۸۳ تک ہمالیہ کے دامن میں پانچ ہزار (۵۰۰۰) کلومیٹر کا سفر پیدل طے کیا اور جنگلات کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ایک مشہور واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

”راجستھان کے ایک کسان اور سماجی کارکن انیل بشوئی کو ۱۰ ہزار کالے ہرن اور چنکاروں (ہرن کی ایک نسل) کو بچانے کا سہرا دیا جاتا ہے، انھیں ایک بار اس وقت جان لیو صورت حال کا سامنا کرنا پڑا جب ایک شکاری نے کالے ہرن کا شکار کرنے کے بعد ان کے سر پر ہندو تان لی تھی۔

میڈیا سے گفتگو میں انھوں نے کہا کہ ”میں ڈر گیا تھا لیکن ہرن کو بچانے کے لیے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا ضروری تھا، شکر ہے کہ ٹیم نے موقع پر پہنچ گئی تھی اور اس شکاری کو گرفتار کر لیا تھا۔“ [7]

اگر کھجری، سئی، جند کے وطن کے حوے سے بات کی جائے تو یہ درخت پورے برصغیر میں قدرتی طور پر پایا جاتا ہے۔ پاکستان میں سندھ، بلوچستان، پنجاب کے خشک اور صحرائی خطے جب کہ ایران سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے بے آب و گیاہ تپتے میدان اور ریگ زار بھی کھجری کے دیس مانے جاتے ہیں۔

قدیم عقائد میں جند کی لکڑی کی آگ مقدس خیال کی جاتی تھی۔ خوشی کے موقع پر اس کے گرد لڑکیاں ایک منفرد اور دل فریب رقص کرتی تھیں جسے ”سئی“ ہی کا نام دیا جاتا تھا۔ یہ گیت اکثر شادی بیاہ کے مواقع پر گایا جاتا ہے اور خالصتاً زنانہ رقص پر مشتمل ہے۔ پاکستان میں اب بھی پنجاب کے کچھ علاقوں میں یہ رقص باقی ہے۔ سئی دراصل عورتوں کے لیے مخصوص ہے اور مردوں کے رقص جھومر کا متبادل ہے۔ ایک لڑکی درمیان میں کھڑے ہو کر گاتی ہے اور باقی دائرے میں اس کے گرد گھوم کر رقص کرتی ہیں اور تالی سے تال دے کر سماں باندھ دیتی ہیں۔

مذکورہ گیت کس زبان میں لکھا گیا اور کس نے لکھا، اس کے بارے میں جاننا ذرا مشکل ہے۔ کوئی ایک اسے گجراتی گیت خیال کرتا ہے تو کوئی دوسرا اسے پنجابی نغمہ کہتا ہے مگر شفا اللہ روکڑی کی گانگی کے بعد اسے سرانجی زبان سے منسوب کیا جانے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ اس گیت کو ”کثیر لسانی گیت“ کا درجہ بہ آسانی دیا جاسکتا ہے۔

ہماری لوک داستانوں میں ایک قصہ ڈھول سئی کا بھی ہے۔ ہماری لوک داستانیں منظوم ہیں اور انھیں گانے کا بھی ایک مخصوص انداز ہے۔ ڈھول سئی عموماً شادی بیاہ کے مواقع پر ہی کیا جاتا ہے۔

اصغر گورواری نے اپنی تحقیق کے نتیجہ میں مذکورہ گیت کو پنجابی لوک گیت گردانا ہے:

پنجابی لوک گیت:

سئی	میری	وار	میں	واری
میں	واریاں	نی	سئی	اے
چن	دی رات	دا	چانناں	نی سیے
اساں	تے دل	نیں	لاواناں	نی سیے

راتاں لمیاں کالیاں نی سیے
گھڑیاں گھمراں والیاں نی سیے
اچے چو بارے پھل پئے کھلے
نت نہ کریے سودے دل دے
وچ سوئے دے تردیاں مچھیاں
گلاں کریے سچیاں سچیاں
سی میری وار میں واری

شاعر: نامعلوم [8]

ترجمہ: 1- اے سنی! اب فدا ہونے کی باری میری ہے۔ میں قربان گئی۔ اے سنی میری جان تجھ پر نثار۔

2- اے سنی! چاندنی رات کی چاندنی ہے۔ ہم نے دل نہیں لگانا۔

3- اے سنی! راتیں لمبی اور کالی ہیں اور بہت ہی زیادہ مشکل صورت حال ہے۔

4- اونچے چو بارہ پر پھول کھل رہے ہیں۔ ہمیشہ دلوں کا سودا نہیں کرنا۔

5- نالے میں مچھلیاں تیر رہی ہیں تو ہم سچی سچی باتیں کریں۔

مذکورہ بالا گیت کو اگر محولہ بالا واقعہ کے سیاق و سباق کی روشنی میں دیکھا جائے تو سوائے اس گیت کے مکھڑا کے کوئی بھی امر اس واقعہ سے تال میل نہیں رکھتا۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ”کھجری“ درخت کے پس منظر میں جو گیت کسی نے لکھا تھا (اگر لکھا تھا) تو وہ گیت دست یاب نہیں ہو سکا اور جو گیت گائے گئے ہیں ان میں سے کسی ایک کا بھی ۱۷۳۷ء کے واقعہ سے قطعاً کوئی تعلق نہیں بننا اور یہ نعمات سرا سر عشقیہ موضوع کے حامل ہیں۔

”سنی میری وار میں واری“ ایک معروف لوک گیت ہے جو اپنی کثیر تہذیبی اور کثیر لسانی خصوصیات کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ اس گیت کی جڑیں پنجاب کے خطے میں پیوست ہیں، جو تاریخی اور ثقافتی طور پر مختلف اثرات کا مرکز رہا ہے۔

کثیر لسانی پہلو:

اس گیت کی سب سے نمایاں کثیر لسانی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بنیادی طور پر پنجابی زبان میں ہے، لیکن اس میں سرانجی زبان کے اثرات بھی نمایاں طور پر محسوس کیے جاتے ہیں۔ پنجاب اور جنوبی پنجاب (جہاں سرانجی بولی جاتی ہے) کی سرحدوں پر ایان علاقوں میں جہاں یہ دونوں زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں، وہاں اس گیت کو مختلف لہجوں اور الفاظ کے ساتھ گایا جاتا ہے۔ بعض اوقات اس میں مقامی dialects کے الفاظ یا فقرے بھی شامل ہو جاتے ہیں، جو اس کی لسانی پرتوں کو مزید گہرا کر دیتے ہیں۔ اس طرح، یہ گیت صرف ایک زبان تک محدود نہیں رہتا، بلکہ کئی زبانوں اور لہجوں کا امتزاج بن جاتا ہے۔

کثیر تہذیبی پہلو:

”سنی میری وار میں واری“ گیت میں کئی تہذیبی رنگ شامل ہیں:

- پنجابی ثقافت: یہ گیت بنیادی طور پر پنجاب کی لوک داستانوں اور ثقافت سے وابستہ ہے۔ سنی کا کردار پنجاب کی لوک کہانیوں کا حصہ ہے اور یہ گیت اسی کردار کے گرد گھومتا ہے۔ پنجابی رسم و رواج، احساسات اور روزمرہ زندگی کی جھلک اس کے بولوں اور دھن میں ملتی ہے۔
- صوفیانہ رنگ: پنجاب کی دھرتی صوفیاء کی سر زمین رہی ہے اور لوک ادب پر صوفیانہ خیالات کے اثرات عام ہیں۔ اس گیت میں بھی بعض اوقات گہرے جذباتی اور الہانہ رنگ ملتے ہیں جو کسی حد تک صوفیانہ کلام سے مشابہ ہو سکتے ہیں۔
- مشترکہ ورثہ: چونکہ پنجاب اور ملحقہ علاقے تاریخی طور پر مختلف ثقافتوں اور مذاہب کے ملاپ کا مرکز رہے ہیں، اس لیے اس گیت میں بھی ایک مشترکہ ثقافتی ورثے کا احساس پایا جاتا ہے۔ یہ کسی ایک مخصوص گروہ یا مذہب کے بجائے پورے خطے کے لوگوں کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔

- دیہی زندگی کی عکاسی: اس گیت کے بولوں اور موسیقی میں دیہی زندگی کی سادگی، محبت، جدائی اور انتظار جیسے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ یہ دیہی ثقافت اور وہاں کے لوگوں کے جذباتی Experiences کی عکاسی کرتا ہے۔
- مختلف پر فارمنس: اس گیت کو گانے اور پیش کرنے کے انداز بھی مختلف علاقوں میں مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہ مختلف موسیقی کے آلات اور گانگی کے Acoustic style کو اپناتا ہے، جو اس کی تہذیبی گونا گونی کو ظاہر کرتا ہے۔ کوک سٹوڈیو جیسے پلیٹ فارمز پر اس کی جدید تشکیل میں بھی مختلف موسیقی کے انداز کو شامل کیا گیا ہے جو اسے نئے Cultural contexts سے جوڑتا ہے۔
- اس طرح، ”سہی میری واری“ ایک ایسا لوک گیت ہے جو لسانی اور تہذیبی سرحدوں کو عبور کرتا ہے۔ یہ مختلف زبانوں کے اثرات کو سمیٹے ہوئے پنجاب اور ملحقہ علاقوں کی مشترکہ ثقافت، احساسات اور روایات کی خوبصورت عکاسی پیش کرتا ہے۔ اس کی یہی خصوصیات اسے ایک کثیر تہذیبی اور کثیر لسانی گیت بناتی ہیں۔

سہی میری واری میں واری گیت میں کارفرما تہذیبیں یہ ہیں:

- پنجابی ثقافت
- سرانگی ثقافت
- صوفی ثقافت
- مشترکہ علاقائی ثقافت

- ”سہی میری واری“ گیت میں کثیر لسانی اثرات نمایاں طور پر موجود ہیں، جو اس کی علاقائی جڑوں اور مختلف زبانیں بولنے والے معاشروں میں اس کی مقبولیت کا نتیجہ ہیں۔ یہ گیت بنیادی طور پر پنجابی زبان میں ہے، لیکن اس میں سرانگی زبان کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔ ان کثیر لسانی اثرات کو درج ذیل صورتوں میں دیکھا جاسکتا ہے:
- پنجابی اور سرانگی کا امتزاج: گیت کے بولوں میں پنجابی کے ساتھ ساتھ سرانگی الفاظ اور فقرے کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ امتزاج خاص طور پر پنجاب کے جنوبی علاقوں اور سرانگی وسیب کے سرحدی علاقوں میں زیادہ واضح ہوتا ہے جہاں یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔
- لہجوں کا تنوع: گیت کو مختلف علاقوں میں گانے والے فنکار اپنے مقامی لہجے کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ پنجاب کے مختلف علاقوں (جیسے ماچھی، مالوی، دوابی) اور سرانگی بیلٹ کے مختلف لہجوں کا رنگ گیت کی ادائیگی میں شامل ہو جاتا ہے، جس سے اس کی لسانی گونا گونی بڑھتی ہے۔
- مشترکہ vocabulary: بعض الفاظ ایسے ہیں جو پنجابی اور سرانگی دونوں زبانوں میں مشترک ہیں یا ان میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔ ایسے الفاظ کا استعمال گیت کو وسیع تر سامعین کے لیے قابل فہم بناتا ہے۔
- صوتی اثرات: سرانگی زبان کی اپنی مخصوص صوتیات اور تلفظ کا انداز ہے، جو گیت کی ادائیگی میں شامل ہو کر اسے ایک خاص رنگ دیتا ہے۔ پنجابی بولنے والے فنکار بھی بعض اوقات سرانگی الفاظ یا طرز ادا کو اپنالیتے ہیں۔
- مقامی dialects کا شمول: بعض اوقات، بہت ہی مقامی سطح پر، گیت میں ارد گرد کی دیگر علاقائی بولیوں یا dialects کے الفاظ بھی شامل ہو سکتے ہیں، جو اسے مزید کثیر لسانی بنادیتا ہے۔

یہ لسانی امتزاج قدرتی طور پر جغرافیائی قربت، ثقافتی تبادلوں اور ان علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے میل جول کا نتیجہ ہے۔ ”سہی میری واری“ اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ کس طرح لوک گیت لسانی سرحدوں سے ماورا ہو کر مختلف زبانوں کے عناصر کو اپنے اندر سمو لیتے ہیں اور ایک وسیع تر علاقائی پہچان کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہ کثیر لسانی اثرات ہی اس گیت کی دلکشی اور مقبولیت میں اضافہ کرتے ہیں۔

”سہی میری واری“ کا تہذیبی پس منظر خطہ پنجاب کی صدیوں پرانی عوامی روایات، لوک داستانوں اور دیہی زندگی سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ یہ گیت صرف دھن اور بولوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ اپنے اندر ایک بھرپور تہذیبی تاریخ سموئے ہوئے ہے۔ اس گیت کے تہذیبی پس منظر کے اہم عناصر درج ذیل ہیں:

- لوک داستانوں سے تعلق : اس گیت کا سب سے مضبوط تعلق پنجاب کی مشہور لوک داستانوں اور خاص طور پر ”سہی“ نامی کردار سے ہے۔ یہ داستانیں نسل در نسل سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی ہیں اور اس گیت نے اس کردار اور اس سے وابستہ کہانی کو زندہ رکھا ہے۔ سہی کی کہانی، اس کے جذبات اور اس کے گرد بننے والی روایات گیت کے بولوں میں منعکس ہوتی ہیں۔
 - دیہی زندگی اور معاشرت : گیت کے بولوں اور اس کی سادی مگر پراثر دھن میں پنجاب کے دیہی Pulsation کی عکاسی ملتی ہے۔ یہاں کی زرعی زندگی، میل جول، رسم و رواج، اور لوگوں کے سادہ مگر گہرے جذباتی رشتے گیت کا حصہ بنتے ہیں۔ محبت، جدائی، انتظار اور وصل کی آرزو جیسے موضوعات دیہی Pulsation کا اہم جز ہیں اور اس گیت میں نمایاں ہیں۔
 - مشترکہ تہذیبی ورثہ : پنجاب ایک وسیع خطہ ہے جس میں مختلف علاقے اور ذیلی ثقافتیں شامل ہیں۔ سرایتی وسیب کی ثقافت بھی اس سے جڑی ہوئی ہے۔ یہ گیت ان علاقوں کے لوگوں کے مشترکہ تہذیبی ورثے کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ لسانی حد بندیوں سے اوپر اٹھ کر مختلف طبقات کو ایک لڑی میں پروتا ہے۔
 - صوفیانہ رنگ کا اثر : پنجاب کی ثقافت پر صوفیائے کرام کے تعلیمات اور ان کی شاعری کا گہرا اثر ہے۔ اگرچہ ”سہی میری وار“ براہ راست صوفی کلام نہیں، لیکن اس کے والہانہ انداز، محبوب کے لیے unconditional محبت اور جدائی کے کرب کا بیان بعض اوقات صوفیانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ یہ پنجاب کی اس وسیع ثقافتی روایت کا حصہ ہے جہاں دنیاوی محبت میں بھی ماورائی رنگ تلاش کیا جاتا ہے۔
 - عوامی جذبات کا اظہار : یہ گیت کسی ایک شاعر کی تخلیق ہونے کے بجائے عوامی سطح پر مقبول ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافے اور تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ یہ عوام کے اجتماعی جذبات، ان کی خوشیوں، غموں، امیدوں اور مایوسیوں کا ترجمان بن گیا۔ اس طرح یہ عوام کی آواز بن گیا جو ان کے تہذیبی مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔
 - رسم و رواج میں شمولیت : ماضی میں یہ گیت مختلف دیہی تقریبات، میلوں اور گیدرنگز کا حصہ رہا ہو گا۔ خاص طور پر خواتین کے حلقہ میں اسے شوق سے گایا جاتا رہا ہے۔ یہ اس گیت کی ثقافتی جڑوں کو مزید مضبوط کرتا ہے۔
- ”سہی میری وار میں واری“ صرف ایک گیت نہیں، بلکہ پنجاب کی زرخیز دھرتی، یہاں کے باسیوں کے سچے جذباتوں، ان کی مشترکہ روایات اور ایک ایسے تہذیبی ورثے کی علامت ہے جو آج بھی زندہ ہے۔ اس کا تہذیبی پس منظر اسے محض تفریح کا ذریعہ بننے کے بجائے ایک ثقافتی شناخت عطا کرتا ہے۔
- قدیم ترین گائیکی کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ گیت رونا لیلیٰ اور دینا لیلیٰ کی آواز میں ملتا ہے جس کے بول یہ ہیں:

سہی میری وار، میں واری
میں واری آں نی سہی اے

گلی گلی جی جی اے نی سہی اے
پیر سنبھل کے دھریے نی سہی اے

اوٹھاں دے گل ٹلیاں وے سہی آں
اوٹھاں باغ لٹاڑا وے سہی اے [9]

ایک اور قدیم گائیکی پی ٹی وی پر نامعلوم نسوانی آواز میں ملتی ہے جس کے بول مندرجہ بالا گیت سے مختلف ہیں:

سہی میری وار، میں واری
میں واری آں نی سہی اے

گلی گلی جی جی اے نی سہی اے
پیر سنبھل کے دھریے نی سہی اے

لدی تے جانده شور ول سئی آں

شور داحا کم زور وال سئی آں [10]

عہد حاضر میں یہ گیت بہت زیادہ تبدیلیوں کے ساتھ شرافت علی خان بلوچ کی آواز میں ملتا ہے:

سئی میری وار ، میں واری
میں واری آں نی سئی اے
پہلی پہلی واری دل ہاری
تے میں ہاریاں نی سئی اے
چٹے دی رات دا چاڑاں نی سئی اے
اتناں تے دل ننیں لاوڑاں نی سئی اے
راتاں لمبیاں کالیاں نی سئی اے
گھڑیاں گھمراں والیاں نی سئی اے
اُچے چو بارے پھل پے کھلے
نت نہ سو دے کرے دل دے
وچ دریا دے تردیاں مچھیاں
گلاں کرے سچیاں سچیاں
گلی گلی وگیاں نی سمّ اے
دل دا کی اگوں ہاریاں نی سئی اے [11]

موجودہ زمانے میں یہ گیت شفاء اللہ خان روکھڑی کی آواز میں بھی گایا گیا ہے جس کے بول مزید تبدیلی کی زد میں آگئے ہیں۔

کوک سٹوڈیوز میں گائے گئے گیت میں اردو زبان کے اشعار کی آمیزش کے ساتھ یہ گیت عمیر جیسووال نے اردو اور قرۃ العین بلوچ نے سرائیکی زبان میں

گایا ہے:

سئی میری وار میں واری
میں واریاں نی سیے
چن دی رات دا چانناں نی سیے
اساں تے دل ننیں لاوناں نی سیے
راتاں لمبیاں کالیاں نی سیے
گھڑیاں گھمراں والیاں نی سیے
اچے چو بارے پھل پے کھلے
نت نہ سو دے کرے دل دے
وچ سوئے دے تردیاں مچھیاں
گلاں کرے سچیاں سچیاں
سئی میری وار میں واری [12]

اسی گیت کو ہندوستان میں ہنس راج ہنس اور ہرنجن مان نے بھی بعض تراہیم کے ساتھ گایا ہے۔
گیت ”سٹی میری وار میں واری“ میں لفظ ”سٹی“ کی اصل سنسکرت زبان ہے۔ لفظ ”واری“ اردو، پنجابی اور سرانگی تینوں زبانوں میں بہ طور فعل ماضی مطلق (واحد متکلم مؤنث) استعمال ہوا ہے۔ ”چو بارے“ اور ”دل“ جیسے اسما بھی مذکورہ تینوں زبانوں میں یکساں معنویت کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔
لفظ ”میری“ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں یکساں معنویت کا حامل ہے۔ لفظ ”نی“ اور ”سوئے“ پنجابی زبان میں استعمال کیا جاتا ہے جب کہ باقی الفاظ پنجابی اور سرانگی زبان میں کہیں یکساں املا کے ساتھ تو کہیں معمولی تبدیلی کے ساتھ مستعمل ہیں۔
کہا جاسکتا ہے کہ مذکورہ بالا گیت نہ صرف اپنے اندر بہت سی تہذیبوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے بل کہ یہ گیت کثیر لسانی عوامل یعنی اسما، افعال اور تراکیب کا حامل بھی ہے، لہذا اس گیت کی کثیر تہذیبی اور کثیر لسانی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

حوالہ جات

- 1- محمد نجم الغنی خاں صاحب رام پوری، مولوی حکیم، تاریخ راجگان ہند موسوم بہ وقائع راجستھان، لکھنؤ، ہدم ترقی پریس، جون 1927، ص 202
2. <https://www.dawnnews.tv/news/19559>
- 3- ایضاً
- 4- ایضاً
- 5- ایضاً
- 6- ایضاً
7. <https://www.hungamaexpress.com/news/21129>
8. https://rungewatan.blogspot.com/2023/08/blog-post_27.html
9. <https://www.youtube.com/watch?v=YHSj0iZg4uw>
10. <https://www.youtube.com/watch?v=p3k9fDxHMCE>
11. https://www.youtube.com/watch?v=0vJ_ZLcqbxs
12. <https://www.youtube.com/watch?v=KHLNSxe5Y8A>